اُردو افسانے پر ۱۱/ ۹ کے ثقافتی، تہذیبی اور مذہبی اثرات

ڈاکٹر سائرہ ارشاد
لیکچرر، شعبہ اردو، گورنمنٹ صادق ویمن یونی ورسٹی بہاول پور

Abstract:

Different nations of the world appear to be concerned about their civilization and identity. Muslims living in western countries face particular problems in this regard. The way in which western media has embraced Muslim identity since 9/11 is now a symbol of terrorism and extremism. Due to this world war, the lives of the people of Iraq and Afghanistan have become a question mark. Pakistan is not only an important country but after 9/11 the better field for world power Afghanistan has been considered neighbouring and friendly country of Pakistan.Urdu short story has always been about social change at the human level. The sad scenes that led to the patrician of India and the after situation of the collapse of Dhaka made the creative experience of Urdu writers after their experiences and observations.at time the marshals that followed were not able to repel these creators even with the atmosphere of repression and freedom of experession. The change in the world after the attacks on the world tradse center and the pentagon did not preserve Urdu short stories at the creation level. In this regard rasheed amjad, manshayad, zahida hina,hamid siraj and many other writers of the country made the theme of cultural and religious influences ,which can be traced to the profound influence of 9/11 urdu short story literature

Key words: lifestyle, western modernity, Atheist, Religious hatred, operation Mice, twin towers, Meaninglessness, Extremist, civilization crisis

کلیدی الفاظ: طرزِ زیست، مغربی جدیدیت، لادین، مذہبی منافرت، آپریشن مائس، ٹوین ٹاور، لایعنیت، انتہا پسند، تہذیبی بحران

تہذیب کسی بھی خطے اور مذہب کے اجتماعی طرزِ زیست کی عکاس ہے جب کہ اس تہذیب کے نمائندہ اپنی طرزِ حیات سے گہرا قلبی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ۱۱/ ۹ کے واقعے نے تہذیبوں کے تصادم کو فروغ دیا، پہلے سے موجود تہذیبی کش مکش اور شدت پسندی کی صورت ظاہر ہونے لگی ہے۔ پس ماندہ ممالک کے علاوہ خود کو تہذیبی اور انسانی سطح پر اعلیٰ وارفع سمجھنے والے ترقی یافتہ ممالک بھی اس تعصب سے ماورا نہیں ہو سکے۔ تہذیب کے ساتھ

ساتھ ثقافت بھی ایک مشترک موضوع ہے لہٰذا جہاں تہذیب کا ذکر کیا جائے گا وہاں ثقافت بھی شامل ہو گی۔ تہذیب اور ثقافت ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جاسکتے جب کہ اس حوالے سے مذہب بھی اہم عناصر میں شامل ہے۔

> ''تہذیب معاشرے کے طرزِ زندگی اور طرزِ فکر واحساس کا جوہر ہوتی ہے چنانچہ آلات واوزار، پیداوار کے طریقے، سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، عشق ومحبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ سب تہذیب کے مظاہر ہیں۔''[۱]

پوری دنیا میں اس وقت مغربی کلچر کے مثبت اور منفی اثرات مختلف تہذیبوں پر پڑ رہے ہیں۔ کئی ممالک مغربی جدیدیت سے متاثر ہونے کے باوجود اپنے اپنے کلچر کو تھامے ہوئے ہیں۔ عموماً تہذیب کی شناخت مذہب سے ہوتی ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اگلا نظریاتی و تہذیبی چیلنج اسلام کو قرار دیا گیا۔ موجودہ دور میں مابعد ۱۱/۹ دنیا کا نقشہ از سر نو ترتیب دینے کی خواہش پیدا ہو چکی ہے۔ اس وقت مغربی طاقت اپنے عروج پر ہے۔

> ''مغربی تہذیب اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے اور اس کا جو پھیلاؤ ہے وہ کسی پچھلی تہذیب کو نصیب نہیں ہوا۔''[۲]

پاکستان ۹/۱۱ کے بعد میدانِ جنگ بننے والے ملک افغانستان کا ہمسایہ اور دوست ملک تصور کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں بے شمار مدارس ہیں جہاں طالب علموں کو مذہبی تعلیمات کے ساتھ عسکری تربیت بھی دی جاتی رہی جس کا جواز مذہبِ اسلام میں ''جہاد'' کے تصور کی صورت میں نمودار ہوا۔ ماضی میں دنیا بھر سے مجاہدین کی ایک کثیر تعداد امریکی حمایت کے ساتھ روس کی ''لادین'' حکومت کو ختم کرنے کے لیے سرگرم رہنے اور امریکی سامراج کے اس ایجنڈے کو اپنے تئیں مقدس جنگ سمجھ کر لڑتی رہی۔ بعد ازاں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جب امریکہ اکیلا سپر پاور بنا تو یہی مجاہدین ''دہشت گرد'' کہلوائے۔

> ''پاکستان عسکری اور سیاسی طور پر امریکہ کا اتحادی ہے۔ اس کا اعتراف اپنی جگہ ایک حقیقت ہے لیکن یہاں مذہبی شدت پسندی، دینی مدارس میں مخصوص نصابِ تعلیم، مختلف جہادی تنظیموں کی زیر زمین سرگرمیوں، جمہوریت کے عدم تسلسل کی وجہ سے اسے محبوب کا درجہ نہیں دیا جاتا۔''[۳]

طالبان کے خلاف مختلف کارروائیاں شروع کی گئیں جو آج بھی پاکستانی حکومت کے کمزور احتجاج کے باوجود جاری ہیں۔ نتیجتاً ردعمل میں امریکی عوام کو بذاتِ خود اس کا خمیازہ نہیں بھگتنا پڑا لیکن پاکستان میں بسنے والے بے شمار معصوم لوگ اس کی بھینٹ چڑھے۔ مختلف جہادی تنظیمیں اور مذہبی جماعتیں ''کالعدم'' قرار دیئے جانے کے باوجود افغانستان اور پاکستان کے سرحدی علاقوں میں خود کو منظم کرنے میں مصروف ہیں اور حکومتِ پاکستان کے خلاف برسرِپیکار ہیں۔ اس طرح یہ سوال بھی موضوعِ بحث بنتا رہا ہے کہ یہ جنگ امریکہ کی جنگ ہے یا پاکستان کی؟ بالعموم حکومتی نمائندے اِسے پاکستان کی

اپنی جنگ تصور کرتے رہے جب کہ حزبِ مخالف اسے ایک ایسی امریکی جنگ بتاتے رہے ہیں کہ جس میں ہماری افواج اور عوام کو دھکیل کر گھناؤنا کھیل کھیلا گیا۔

> ''مابعد کی اس دنیا میں دو بلند و بالا عمارتوں کا گرنا، دراصل دو خلاؤں کی تشکیل ہے۔ ایسی تخریب جس کی بنیاد پر نئی تعمیر ہو سکتی ہے۔ یہ واقعہ ایک عہد کی فصیل اور دوسرے عہد کا دروازہ ہے۔ یہ بات بش اور اوباما کی تقاریر سے لے کر، اسکول کے بچوں کے مباحثے تک کئی بار کہی اور سنی گئی ہے کہ گیارہ ستمبر کا دن عہدِ جدید کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے۔ جب پرانی جمی جمائی زندگی کی بساط اُلٹ گئی اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک نیا رشتہ استوار ہوا۔ اس اُلٹی ہوئی بساط کو، اس نئے رشتے کے پیچ و خم کو ہر ایک نے اپنے اپنے فکری، تاریخی اور واقعاتی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔'' [۴]

ڈرون حملوں کے خلاف مذہبی اور بعض سیاسی جماعتوں کے احتجاج بھی جاری رہے اور اس وقت کے صدر پرویز مشرف کے مخصوص نعرے ''سب سے پہلے پاکستان'' کو کہیں ہدفِ تنقید بنایا گیا اور کہیں وقت کی اہم ضرورت سمجھا گیا۔

اُردو افسانہ سماجی تبدیلیوں اور تغیرات کو انسانی سطح پر ہمیشہ بیان کرتا چلا آیا ہے۔ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں جنم لینے والے اندوہ ناک مناظر سے لے کر موجودہ عہد میں کرونائی صورتِ حال تک، اُردو افسانہ نگاروں نے اپنے تجربات و مشاہدات کی بدولت تخلیقی انداز فکر کو ترویج دی ہے ہے۔ پاکستان میں مختلف اوقات میں لگنے والے مارشل لاز کے بعد کی گھٹن اور آزادیٔ اظہار پر جبر کی فضا بھی ان تخلیق کاروں کو باز نہیں رکھ سکی۔

گیارہ ستمبر کے اس حادثے نے ہر ملک کے ادب کو متاثر کیا، لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ ۹/۱۱ کے بعد کی اس ساری صورتِ حال نے دنیا میں جن ثقافتی اور تہذیبی اثرات کو مرتب کیا اور ان اثرات نے جس طرح انسانی نفسیات کو بدلا وہ افسانہ نگاروں کے تخلیقی تجربے کا حصہ نہ بنتا۔

> ''ادیب کا قلم اس کا ہتھیار ہے۔ ادیب اپنے قلم سے جنگ کرتا ہے اور جنگ کے اس طریقہ کار میں وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ بظاہر تو ادیب اس جنگ میں تنہا ہوتا ہے لیکن اصل میں ایسا نہیں ہوتا کہ ادیب کا ساتھ دینے والے عوام اس کے ساتھ ہوتے ہیں کیوں کہ انہی کے لیے وہ قلم اُٹھاتا ہے اور انہی کے لیے اس کے اندر کے تمام بے تاب عناصر اُبھر آتے ہیں۔'' [۵]

۹/۱۱ کے بعد کی عصری صورتِ حال اُردو افسانے کا موضوع بنی اور مختلف انداز سے اس صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا۔

رشید امجد عہدِ حاضر کے نمائندہ پاکستانی افسانہ نگار ہیں جن کی کہانیوں کا مجموعی انداز علامتی ہے۔ وہ علامت کے پیرائے میں افسانوی تخلیق اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں اپنے سماج اور اس میں آنے والی بتدریج تبدیلیوں کا گہرا ادراک ملتا ہے۔

رشید امجد نے کئی اہم سماجی موضوعات کو اپنی افسانوی نثر کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا افسانہ "مجال خواب" "قوموں کے عروج وزوال کے متعلق تمثیلی انداز میں تاریخ کے قبرستان کا سفر بیان کرتا ہے جس میں ایک ایسے نوجوان کو علامت کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے جو تاریخ جاننا چاہتا ہے اس مقصد کے لیے وہ اپنے مرشد کے ساتھ تاریخ کے قبرستان میں داخل ہوتا ہے۔ اسے ہر کتبے پر عروج اور زوال کی پوری داستان تحریری صورت میں ملتی ہے۔

> "عروج ایک نشہ ہے اور نشے میں عقل کام نہیں کرتی۔ یامظہر العجائب! یہ بھی کیا معاملہ ہے کہ بینائی باطن کو تو دیکھ سکتی ہے لیکن قلب کو دیکھنے سے محروم ہے اور قوموں کے فیصلے بینائی کی بنیادوں پر ہوئے ہیں۔ یہ قبرستان بھی کیا عبرت کی جگہ ہے۔" [۶]

"مجال خواب" میں وقت اور رفتار کا تصور ملتا ہے۔ قومیں اپنے عروج وزوال سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتیں بلکہ وہ ہمیشہ نشیب وفراز کا شکار رہتی ہیں، جو قومیں اپنا وجود کھو دیتی ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وقت کی قدروا ہمیت کو ضروری سمجھنے کی بجائے خود کو حالات کے آسرے پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے حال سے باخبر اور ماضی سے سبق حاصل کر چکے ہیں انہیں کبھی زوال نصیب نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے آنے والے کل کی فکر میں جدوجہد کرتے ہیں۔

اُردو افسانے کا ایک اور معتبر حوالہ منشایاد کا ہے۔ ان کے افسانے مشاہدے کی گہرائی اور عمیق تجربات کو اجاگر کرتے ہیں۔ منشایاد نے بھی ۹/۱۱ کے اثرات اور جہادی تنظیم کے شدت پسند رویے کو اُجاگر کیا۔ ان کے اس موضوع کے حوالے سے لکھے گئے افسانے "ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ" میں متوسط طبقے کی ذہنیت سے آگاہ کیا گیا کہ کس طرح مجبوریوں اور غربت میں جکڑے پس ماندہ طبقے کے لوگ مذہب کے حوالے سے بظاہر راسخ العقیدہ بن جاتے ہیں اور بحیثیت مجاہد "شہادت" کے درجہ پر فائز ہونا چاہتے ہیں۔ اس افسانے میں معاشرتی طور پر جڑ پکڑتی ہوئی جہادی تنظیموں کی سوچ کو واضح کیا گیا ہے۔ شاطر ذہنیت کے حامل افراد معصوم لڑکوں کو اپنی باتوں سے گھائل کر کے مختلف طرح کے مقاصد میں استعمال کرتے ہیں۔ امین نامی لڑکے کے وصیت نامے سے گھر کی محبت اور اپنوں کے رنج والم کو محسوس کرنے کی کیفیت تو ملتی ہے لیکن حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے اسے بھی یہی لگتا ہے کہ وہ دنیا کو فراموش کر کے انتہا پسند مجاہد کے روپ میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہو جائے۔

> "آج دنیا کی تمام کافر طاقتیں اسلام کو مٹانے کے لیے پوری کوشش کر رہی ہیں۔ آج مسلمان مغلوب ہیں، آج کشمیری کی طرف دیکھ لیں۔ فلسطین، عراق اور افغانستان کی طرف دیکھ لیں۔ مسلمان بہنوں اور ماؤں کی عزتوں کو پامال کیا جا رہا ہے۔ مسلمان بوڑھوں اور بچوں کو بے گناہ شہید کیا جا رہا ہے۔ وہ کیا ہے۔ یہی کہ وہ لا الٰہ پڑھتے ہیں۔ یاد رکھیں اگر آج ہم نہ نکلے تو کل وہ ہمارے گھروں پر پھر چھانے والے ہیں۔" [۷]

یہ بات قابل غور ہے کہ مولانا سراج الدین خود اس جنت کا متلاشی کیوں نہ ہوا جس کی خواہش وہ اپنے شاگردوں میں پیدا کرتا ہے۔ مولانا سراج الدین کے پس پشت ایسی قوت کارفرما ہے کہ جس کے اشاروں پر وہ مختلف احکامات جاری کرتا ہے۔ یہ کردار صرف معاشرتی طور پر ہی نہیں پائے جاتے بلکہ

ان کا سرا کہیں نہ کہیں عالمی سطح پر بھی موجود ہے۔ اہل مغرب اپنے ہاں مقیم مسلم اکثریت سے خوف محسوس کرنے لگے، یہاں تک کہ مسلمان خود کو مجبور اور بے کس سمجھتے ہوئے دوہری اذیت کا شکار ہوئے۔ منشایاد نے باریک بینی سے ان تمام پہلوؤں کو کہانی کا حصہ بنایا ہے۔

مقصود الٰہی شیخ کے افسانے ''منجمد مناظر'' میں موجودہ ملکی صورتِ حال کے حوالے سے معاشرتی عدم تحفظ اور خوف کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے میں بھی جہادی تنظیموں کی دہشت گردی کے حوالے سے کی گئی کارروائیوں میں معصوم اور بے قصور نوجوانوں کو ورغلا کر اپنے عزائم کی تکمیل کو موضوع بنایا گیا ہے، مرکزی کردار فیض الاسلام دینی تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے لیکن اس کی عسکری تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ خود کش حملے کو جہاد سمجھتے ہوئے اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔

> ''راول پنڈی میں ایک خود کش حملہ آور کو رینجرز نے للکارا تو اُس نے دھماکا کر دیا اور ہلاک ہو گیا۔ اس کا سر لڑھک کر دور جا پڑا اور یہ سر ٹی وی سکرین پر دیکھا بھی گیا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ فیض الاسلام کا سر تھا۔''[۸]

دینی مدارس کے نام پر قائم اکثر ادارے اپنی مخصوص سوچ اور جہاد کا جھانسہ دے کر نوجوان نسل کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ وہ ان میں یہ احسا س پیدا کرتے ہیں کہ دنیا کی زندگی عارضی جب کہ آخری آرام گاہ موت ہے۔ لہٰذا نوجوان اپنے قریبی رشتوں اور دنیاداری سے دل اُچاٹ کر کے موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

زاہدہ حنا کا شمار صفِ اوّل کی افسانہ نگار خواتین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی ۹/۱۱ کی شدت اور اثرات پر قلم آزمائی کی ہے انھوں نے افسانہ ''نیند کا زرد لباس'' میں افغانستان کی ناگہانی آفت کو موضوع بنایا۔ مرکزی کردار تیرہ سالہ افغان بچی پروین کی زندگی کے نہایت کٹھن اور تلخ تجربات بیان کیے گئے ہیں۔ انتہائی ذہین اور خداداد صلاحیتوں کی مالک پروین کابل میں دھماکوں کی وجہ سے اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہو جاتی ہے جب کہ خاندان کے دیگر کئی افراد ان حملوں میں مارے جاتے ہیں۔ وہ بچ جانے والے افراد کے ساتھ ''باجوڑ'' پہنچتی ہے۔ باجوڑ خالی کرانے کا حکم ہوا تو وہ دوبارہ کابل روانہ ہو گئی اور راستے میں امریکی بموں نے اس کی جان لے لی۔ اس کی لاش دوبارہ ''باجوڑ'' پہنچی تو مٹھی میں فریاد کی صورت خط میں ایک جگہ لکھا تھا۔

> ''آپ نے میرے بھائی بہن چھینے، میرا شہر، میرا گھر، میری گلیاں، میرا بچپن، میرے خواب چھینے۔ آپ نے میری ہتھیلی بھی چھین لی، آپ کے بھیجے ہوئے جہاز جب ہمارے لیے بسکٹ کے پیکٹ، مکھن کی ٹکیاں اور رنگ برنگ کی تتلیاں گرا رہے تھے تو میں اور میری کئی سہلیاں اِن تتلیوں کو اُٹھانے کے لیے بھاگیں، بسکٹ کے پیکٹ اور مکھن کی ٹکیاں اُٹھانے والے بچ گئے۔ تتلیاں پکڑنے والی میری دو سہیلیوں کو تتلیاں اپنے ساتھ لے گئیں اور میری ایک ہتھیلی بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ ہم نہیں جانتے کہ امریکی بچے بارودی تتلیوں سے کھیلتے ہیں۔''[۹]

افسانے میں براہِ راست امریکی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ غم و شکایت کی گہری کیفیت پر مشتمل یہ افسانہ ان افغان مہاجرین کا نوحہ ہے جو بے یار و مددگار کبھی پاکستان سے پناہ لیتے ہیں تو کبھی اپنی دھرتی پر دھماکوں کے ساتھ زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا رہتے ہیں۔

حامد سراج جدید اُردو افسانہ نگاروں میں نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا افسانہ "زمیں زاد" سائنسی طرز پر مبنی ہے۔ سائنس دان اس بات کا حتمی فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ مریخ پر انسان کو بھیجیں گے۔ تیار کردہ آکسیجن سلنڈر میں آکسیجن کی مقدار پانچ ہزار سال تک ہوتی ہے۔ مذہبی سکالرز اور سائنس دانوں میں بحث ہوتی ہے۔ مذہبی سکالرز تمام مذاہب کی کتابیں بھجوانا چاہتے تھے جب کہ سائنس دان یہ موقف اختیار کرتے ہیں۔

> "زمین پر فساد کی جڑ مذہب ہی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آگ کے گولوں سے ایٹم کی تباہی تک جتنے بھی ہتھیار ہیں وہ مذہبی منافرت کی بنیاد پر ہی ایجاد ہوتے ہیں۔ امن قائم کرنے کی آڑ میں اپنے مفادات کی جنگیں لڑی جاتی ہیں۔"[۱۰]

بالآخر مذہبی سکالرز کی بات مان لی گئی اور ایک جوڑا مریخ کے سفر پر روانہ کر دیا گیا جنہیں تمام مذاہب اور سائنسی علوم پر مہارت حاصل تھی۔ خوراک کا ایک کیپسول سال بھر کے کھانے پینے سے نجات دلا دیتا۔ انسان کی بظاہر ترقی لمحۂ فکریہ ہے، جدید سے جدید تر کی دوڑ سے باہمی رشتوں میں دوری آچکی ہے۔ افسانے میں حامد سراج کا مذہبی نقطۂ نظر اِس قدر حاوی ہو گیا ہے کہ سائنسی تحقیق اور تنہائی کا جان لیوا عذاب، مذہب کی آڑ میں چھپ جاتا ہے۔

محمد حمید شاہد کے افسانوی مجموعے "مرگِ زار" میں اکثر کہانیاں ۹/۱۱ کے اثرات پر مشتمل ہیں۔ افسانہ "گانٹھ" میں تارکین وطن کی زندگی میں اس واقعے کے بعد رونما ہونے والی تبدیلی کو بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر توصیف جیسے کئی کردار ہمارے معاشرے میں پائے جاتے ہیں جو وطن سے باہر کمانے کی غرض سے جاتے ہیں اور دن رات کی مسلسل محنت سے اپنا ایک مقام بنا لیتے ہیں۔ ان کے خلوص اور ایمان داری پر شک نہیں کیا جا سکتا مگر ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے بعد امریکہ اشتعال میں آ گیا اور ایسے لوگوں کی نفسیات بری طرح متاثر ہوئی جو وہاں کی ہر پسند و ناپسند پر اپنا سر اطاعت میں جھکا کر زندگی سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔

> "ایک پس ماندہ ملک کے بے وسیلہ، غیر مہذب جاہل لوگوں کے بے ہنگم اور بے اصول معاشرے میں رہنے سے بدرجہا مناسب اسے یہ لگا کہ وہ یہیں انسانیت کی خدمت میں جتا رہے۔ مگر ایک روز یوں ہوا کہ وہ شہر دھماکوں سے گونج اُٹھا اور سب کچھ اتھل پتھل ہو گیا۔ جب وہ حادثے میں اعصابی جنگ ہارنے والوں کو زندگی کی طرف لا رہا تھا۔ اسے سماجی خدمت جان کر، کسی معاوضے اور صلے سے بے نیاز ہو کر تو اسے خلیج کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا جسے بہت سال پہلے پاٹنے کے لیے اس نے اپنے وجود سے وابستہ آخری نشانی، اپنے نام توصیف کو بدل کر طاؤز ہو جانا بخوشی قبول کر لیا تھا۔"[۱۱]

مبین مرزا کا افسانہ "دامِ وحشت" میں مرکزی کردار شیخ سخاوت علی کی نمازِ جمعہ میں ایک مشکوک شخص پر نظر پڑی اور اسے شک گزرا کہ وہ کوئی خود کش حملہ آور ہے۔ اس افسانے میں معاشرتی رویوں کو نمایاں کیا گیا ہے جس طرح ۹/۱۱ کے بعد لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا وہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ ایسے تمام افراد جو مغرب میں داڑھی رکھتے ہیں انہیں اپنے ہی وطن میں مشکوک انداز سے دیکھا گیا یوں یہ تاثر مجموعی صورت اختیار کر گیا۔

> "لمبا سفید چوغہ، سر پر رنگ دار عمامہ، گھنی داڑھی، سرخ و سپید چہرہ اور چہرے میں پوری طرح سجا ہوا گہرا اطمینان...... ایک ایک چیز، سب کچھ مشکوک لگ رہا تھا۔ یہ آدمی ضرور اپنے جسم سے بم باندھے بیٹھا ہو گا۔ اور جب جماعت کھڑی ہو گی تو پہلی رکعت میں یا دوسری رکعت میں یہ خود ہی پھٹ جائے گا اور اس کے ساتھ...... شیخ سخاوت علی کی نگاہوں میں وہ سارے منظر پھر گئے جو مسجدوں اور امام بارگاہوں میں دھماکوں، خود کش حملوں کے حوالے سے ٹی وی پر اب تک دکھائے گئے تھے۔ کٹے پھٹے جسم، ٹکڑے ٹکڑے بکھرتے انسانی اعضاء، گاڑھا خون...... اوہ خدایا!"[۱۲]

۹/۱۱ کے بعد ملکی صورتِ حال کے مہلک اثرات سامنے آئے۔ مساجد بھی ایسے گھناؤنے واقعات سے محفوظ نہیں، عبادت گاہیں جو کبھی "پناہ گاہ" تصور کی جاتی تھیں، اب غیر محفوظ ہو چکی ہیں اور داڑھی کو خطرے کی علامت سمجھا جانے لگا ہے۔

نیلوفر اقبال کو اُردو کی افسانہ نگار خواتین میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کا افسانہ "اوپریشن مائس ۱۱" جنرل موسیٰ اور اُن کی بیگم مارتھا کے مابین ۹/۱۱ کے فوراً بعد کی صورتِ حال پر مشتمل مکالمہ ہے۔ جنرل مرسی ۹/۱۱ کے نتیجے میں آپریشن مائس سے متعلق اہم میٹنگ میں شرکت کی تیاری کرتا ہے۔ وہ متضاد رویوں کا مالک ہے، جانوروں سے محبت میں انتہا کا رحم دل ہونے کے باوجود ٹی وی پر اپنے خلاف ہونے والے مظاہروں کو سمجھنے میں ناکام رہتا ہے۔ مارتھا مار دھاڑ اور قتل و غارت گری کے واقعات سن کر اضطراب کا شکار ہو جاتی ہے تو جنرل مرسی کہتا ہے۔

> "ٹوِن ٹاور میرا بھی پیار تھے۔ میرا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوا تھا۔ جرنلز بھی آخر انسان ہی ہوتے ہیں مارتھا لیکن ہم امریکن کیا کھویا اور کیا گنوایا پر ٹھہر جانے والی سپرٹ کے ساتھ زندہ رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہماری نگاہ وہاں ہوتی ہے جہاں ہمیں پہنچنا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم اس جنگ سے جو حاصل کر لیں وہ دو ایک عمارتوں کے تباہ ہونے کے نقصان سے کئی سو گنا زیادہ ہو۔"[۱۳]

افتخار نسیم کا افسانہ "پردیسی" اسلم کی کہانی ہے جو 1947ء کے ہنگاموں میں پیدا ہوا۔ پناہ گزینوں کے کیمپ سے امریکہ تک کا سفر مشکلات سے بھرپور ہے، تاہم چالیس سال ۹/۱۱ کے نتیجے میں ہونے والی تباہی اسے اضطراب میں مبتلا کر دیتی ہے، اپنی پہچان کی گم شدگی ایک دھندلی تصویر کی مانند اس کے ذہن و دل کو جکڑے رکھتی ہے۔

> "ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں مگر اس کے رنگ اور نسل کے سب لوگوں کو مجرم گردانا جا رہا ہے اور ڈانٹا جا رہا ہے۔ آخر اس کا ملک کون سا ہے؟ اس کا وطن کہاں ہے۔"[۱۴]

افسانہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا واقعہ انتہائی اہم ہونے کے باوجود اس حقیقت کا عکاس ہے کہ تقسیم شناخت کو ختم کر دیتی ہے۔ اس افسانے میں امریکہ کی پالیسیوں کا تذکرہ شامل ہے کہ جس کا ادراک ۱۱ ستمبر کے فوراً بعد ہی پاکستانیوں کو ہو گیا تھا۔ افتخار نسیم کے اس افسانے میں مسلم اُمہ کو درپیش مسائل کا حوالہ دیا گیا ہے۔

افتخار نسیم کا افسانہ ''آخری قسط'' ایک پاکستانی نوجوان افضل کی کہانی ہے جو امریکہ کمانے کی غرض سے جاتا ہے اور وہاں کی جنسی ہوس میں بری طرح مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں تہذیبی کش مکش کے علاوہ مذہب سے متعلق گہرا نقش موجود ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار جو خود کو مادر پدر آزاد معاشرے میں ڈھال لیتا ہے اور اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ

''کبھی کبھی ہم غلط جگہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی پیدائش پر کوئی اختیار نہیں لیکن رہائش پر تو ہے۔ میں نے امریکہ کو چن لیا، زندگی ویسے بھی قرضہ ہے جو ختم ہو جاتا ہے تو ہم مر جاتے ہیں۔'' [۱۵]

فرخ ندیم کا افسانہ ''چودھویں رات کی سرچ لائٹ'' میں انسانوں کو جانوروں کی اقسام کے ذریعے منقسم کیا گیا ہے۔ نیشنل جیوگرافک کے نمائندے اپنے کیمروں کے ہمراہ ''وادی سوانا'' میں داخل ہیں۔ اس جنگل میں مختلف طرح کے حشرات الارض کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ کس طرح ہر جاندار اپنی خصوصیات میں انسانوں جیسا نظر آتا ہے اس افسانے میں بظاہر ٹیلی وژن کے ایک پروگرام کی تفصیل ملتی ہے، در حقیقت انسانوں اور جانوروں کی مشترک خصوصیات کو اُجاگر کیا گیا ہے جس طرح انسان اپنی طاقت، تیز رفتاری اور موقع پرستی سے کام لیتا ہے بالکل اسی طرح جانوروں میں بھی یہی حربے استعمال ہوتے ہیں۔ گوشت خوروں کو تین طبقوں میں بیان کر کے انسان کی حقیقت سے پردہ اُٹھایا گیا ہے۔

''اس جنگل میں جس کو بھی شہزادہ بننا ہے اُس کے لیے تین واضح اصول ہیں۔ ایک طاقت، دور فتار اور تین موقع پرستی۔'' [۱۶]

یہی اصول انسانوں میں بھی نظر آتے ہیں کہ وہ اپنی طاقت سے کمزور کو کچل دیتا ہے۔ اسی بناء پر آج دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ اقتدار کا نشہ تکبر میں مبتلا کر دیتا ہے، جس طرح ۹/۱۱ کے بعد امریکہ کا غرور ٹوٹا تو وہ طاقت کے نشے میں عراق اور افغانستان کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہو گیا۔

فاروق خالد کا افسانہ ''کارگر'' فوج کے ایک باریش آدمی کی کی لایعنیت پر مبنی سفر کی کہانی ہے۔ اسے اس رائیگاں سفر کا کوئی سرا نہیں ملتا۔ یوں لگتا ہے جیسے حالات وواقعات نہایت اُلجھاؤ پر مبنی ہیں۔ افسانے میں خوف، بے چینی اور کش مکش کی فضا شامل ہے۔ انسان کو ایک وحشت زدہ مخلوق کے طور پر پیش کیا گیا ہے، افسانے میں حقیقت سے فرار کے علاوہ ادھورے خوابوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مرکزی کردار ایک درویش سے ملتا ہے تو اسے معمول سے مختلف منظر دکھائی دیتا ہے۔

''بالآخر اس نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں تو درویش کے چہرے پر ایک چمک سی طاری ہوئی تھی اور اس نے ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایک قبر کے تابوت میں رکھی ایک شہید کی لاش بارود کی صورت میں انہیں اپنا نذرانہ پیش کرتی ہے جسے ان میں سے کسی ایک کو اپنے ساتھ لے کر اسی کی قیادت میں ایک حقیقی ودائمی وصال کے لیے اپنا آخری سفر اختیار کرنا ہے۔'' [۱۷]

گلزار ملک نے افسانوں میں معاشرتی مسائل کے علاوہ ملکی صورتِ حال کے حوالے سے بھرپور لکھا ہے۔ ۹/۱۱ اس موضوع پر ان کے تین افسانے ''قفس''، ''گل شدہ شمعوں کا نوحہ'' اور ''غلام آباد'' شامل ہیں۔

> ''ان کہانیوں میں زندگی کے بہت سے نظریاتی اور فطری پہلو اور مباحث سمٹ آتے ہیں۔ معاشرت کی رنگارنگ تصویریں، فن اور اسالیب کے متنوع رنگ شامل ہیں۔ زبان عمدہ اور معیاری ہے اور اظہارِ بیان میں پختگی اور تازگی ہے۔''[۱۸]

''قفس'' سرحدی علاقے میں رہنے والے ''لاکھو'' کی کہانی ہے۔ افسانہ براہِ راست ان لوگوں کے ذکر پر مبنی ہے جنہیں امریکہ نے تشدد اور ظلم وبربریت کی انتہا قائم کرتے ہوئے گوانتانا موجیل میں رکھا۔ لاکھو ''جہاد'' کا تصور لے کر اپنے گھر کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جس کے گھر آگ لگے اسے بجھانے کی کوشش میں انسان بعض اوقات خود اس آگ میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ لاکھو جذبۂ ایمان لے کر نکلا تھا جب کہ ٹکرانے والی قوت اسلحے سے لیس حفاظتی اقدامات سے واقف ہو تو پھر لاکھو ایسے کئی لوگوں کو چٹکیوں کی طرح اُڑا سکتی ہے۔ افسانہ مجبور و بے کس لوگوں پر کیے گئے ظلم و ستم کی داستان ہے۔

گلزار ملک کا دوسرا افسانہ ''گل شدہ شمعوں کا نوحہ'' میں تجریدی طرز میں عدم تحفظ اور غیر یقینی کی فضا اُجاگر کی گئی ہے۔ کہانی میں بظاہر کوئی کردار نہیں ملتا نیز غیر یقینی کی فضا قائم کی گئی ہے۔ چٹیل میدان میں خوف زدہ ہو کر ہتھیاروں کا تذکرہ واضح کرتا ہے کہ ۹/۱۱ کے بعد عراق پر ہتھیاروں کے چھپائے جانے کا الزام لگایا گیا، تلاش بسیار کے باوجود ہتھیار نہ ملے اور اس سارے عمل میں بے شمار زندگیاں ختم ہو گئیں۔

گلزار ملک کا افسانہ ''غلام آباد'' ستر سالہ بوڑھے کی کہانی ہے جو بس سٹاپ پر بہت سے دوسرے مسافروں کے ساتھ بارش کے رکنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا جواں سال بیٹا دہشت گردی کے واقعات میں مارا جاتا ہے۔ ۹/۱۱ کے بعد امریکہ نے جس طرح ایک مسلمان کی پہچان دہشت گرد اور انتہا پسند کے طور پر کرائی، یہی کش مکش ہے کہ جب ''غلام آباد'' جانے پر بوڑھا چلا اُٹھتا ہے تو باقی لوگ اس کا ساتھ دینے کی بجائے ایک طرف ہٹ جاتے ہیں۔ وہ سب خود کو ذہنی طور پر ''غلام'' بنا چکے تھے۔ بوڑھے کا رویہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے ہاں قابلیت کو معیار بنانے کی بجائے اقتدار پر محض چند لوگوں کی حکمرانی تنزلی کی علامت ہے۔ وہ ''جنت'' کے تصور پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> ''ہم سب جنت کی چاہ میں سرگرداں ہیں، زندہ ہیں پر مردوں سے بدتر، جسے ڈھونڈنے نکلے وہ ملتی ہی نہیں کہیں، راستہ دکھلائے کون؟ امیر کارواں نہ فریاد سننے والا کوئی، سب گم گشتہ خواہشوں کے سراب میں ہلکان، کوئی بتلائے تو وہ جنت کیا ہوئی۔ جس کے خواب اِک نسل کی آنکھوں کا تارا تھے۔''[۱۹]

بظاہر یہ تصور ''مجاہد'' کی بھی آرزو بن جاتا ہے جس کی کوشش میں وہ زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔ ہم جہاں قیام پذیر ہیں وہاں کے حالات ہمیں جنت کے لالچ میں جہنم سے بدتر دکھائی دیتے ہیں۔

اردو افسانہ نگاروں نے دہشت گردی، خوف اور شناخت کے بحران جیسے موضوعات سے پاکستانی معاشرے کی عکاسی کی ہے، عدم تحفظ کا شکار زندگی اور موت کے منڈلاتے سائے جہاں عام لوگوں نے شدت سے محسوس کیے وہیں ادیب بھی اس ساری صورتحال میں قلم کو بطور ہتھیار استعمال کرنے پر مجبور ہوا۔ ان افسانوں میں تمدن اور معاشرت کو نمایاں طور پر شامل کیا گیا ہے۔ افسانہ نگاروں نے خوف و بے یقینی کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ احساس دلایا کہ ایسی صورتحال ثقافتی، تہذیبی اور مذہبی حوالے سے کس قدر سنگینی کا باعث ہے۔ ۹/۱۱ کے تناظر میں جنم لینے والا یہ تہذیبی بحران اب ایک تسلسل کے ساتھ اُردو افسانے کا موضوع بن رہا ہے جس پر آنے والے دنوں میں بھی بہت سی کہانیاں لکھی جائیں گی۔ اُردو ادب کے جن دیگر افسانہ نگاروں کے ہاں اس صورتِ حال کے تہذیبی و ثقافتی اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں اُن میں معراج نیر، کمال مصطفی، حفیظ شیخ، انور خلیل شیخ، حفیظ کاشمیری، عمر حیات، شبیر حسین قمر، سہیل جاوید، احمد اعجاز، منیر الدین احمد، ارشاد احمد صدیقی، اکبر بریلوی، سعید انجم، اسماء وارثی، نغمانہ شیخ، صفیہ صدیقی، افضل توصیف، خالد سہیل اور شائستہ سیّد ایمن اور فرحت پروین شامل ہیں۔ یوں اردو افسانے کو مابعد ۹/۱۱ کے تناظر میں دیکھا جائے تو تہذیب و ثقافت کے متعدد مظاہر اپنا عکس دکھاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سبطِ حسن، سیّد، ''پاکستان میں تہذیب و ارتقاء (کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۳

۲۔ محمد مجیب، ''دنیا کی تاریخ (کراچی، سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۴۲

۳۔ محمود شام، ''امریکہ کیا سوچ رہا ہے (کراچی، ویلکم بک پورٹ پرائیویٹ لمیٹڈ، مین اُردو بازار، جنوری ۲۰۰۵ء)، ص ۳۱۷

۴۔ نجیبہ عارف، ''۱۱/۹ اور پاکستانی اُردو افسانہ'' (منتخب افسانے) (اسلام آباد، پورب اکادمی، مئی ۲۰۱۱ء، طبع اوّل) ص ۱۱

۵۔ سہیل احمد، (مرتب)، ''پاکستانی زبان و ادب پر ۹/۱۱ کے اثرات'' مقالات بین الاقوامی ادبی سیمی نار، باڑہ گلی سمر کیمپس، ادارہ ادبیاتِ اُردو، فارسی و لسانیات، جامعہ پشاور، ۷ تا ۱۱/ اگست ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۱

۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ''مجالِ خواب''، مشمولہ ''سمبل''، اسلام آباد، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء، ص ۲۰۵

۷۔ منشایاد، ''ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ''، مشمولہ، ''دنیازاد'' کتابی سلسلہ نمبر ۲۵، کراچی، ص ۱۵۸

۸۔ سعید نقوی، سیّد، ڈاکٹر، (مرتب) ''مغرب میں اُردو افسانہ (کراچی، رنگ ادب پبلی کیشنز، ستمبر ۲۰۱۲ء)، ص ۵۲۴۔۵۲۳

۹۔ زاہدہ حنا، ''نیند کا زرد لباس''، مشمولہ ''دنیازاد''، کتابی سلسلہ نمبر ۵۲، کراچی، ص ۱۸۶

۱۰۔ حامد سراج، ''وقت کی فصیل (اسلام آباد، پورب اکادمی، اگست ۲۰۰۹ء، طبع دوم) ص ۵۰

۱۱۔ محمد حمید شاہد، ''مرگ زار (کراچی، اکادمی بازیافت اُردو بازار، ۲۰۰۴ء) ص ۸۰

۱۲۔ معراج نیر، سیّد، ڈاکٹر، ''تہذیبی تصادم کے افسانے (لاہور، گنج شکر پریس، ۲۰۰۸ء) ص ۱۸۲

۱۳۔ نیلو فر اقبال، اوپریشن مائس 11، مشمولہ فنون لاہور، شمارہ۱۱۹، ص۱۸۱

۱۴۔ افتخار نسیم، ''پردیسی''، مشمولہ ''فنون''،لاہور، شمارہ۱۱۷، ص۱۵۶

۱۵۔ جواز جعفری،ڈاکٹر، ''اُردو افسانے کا مغربی دریچہ (لاہور،، میٹرو پرنٹرز،۲۰۰۹ء)ص۵۳۹۔۵۳۸

۱۶۔ فرخ ندیم، ''چودھویں رات کی سرچ لائٹ''، مشمولہ ''نقاط''، فیصل آباد، شمارہ۳، ص۱۰۳

۱۷۔ فاروق خالد، ''کارگر''مشمولہ ''دنیازاد''، کتابی سلسلہ نمبر۲۵، کراچی، ص۱۹۶

۱۸۔ گلزار ملک، (فلیپ) ''آگ (فیصل آباد، مثال پبلشرز،۲۰۰۶ء، باراوّل،)ص۵۶

۱۹۔ گلزار ملک، ''اندھوں کی بستی میں محبت (فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۲ء)ص۵۷